Gohar e tehqeeq گوہر تحقیق
گورنمنٹ صادق کالج ویمن یونیورسٹی بہاول پور
Year 2022; Vol 01 (Issue 01)
P. 12-24 https://journals.gscwu.edu.pk/

ڈاکٹر عبدالعزیز ملک

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد

ڈاکٹر ناصر محمود

ڈپٹی ہیڈ ماسٹر، گورنمنٹ ہائی سکول، چک نمبر 17 منوبی، سرگودھا

Dr. Abdulaziz Malik

Assistant Professor, Department of Urdu, Government College University, Faisalabad

Dr. Nasir Mahmood

Deputy Head Master, Government High School, Chak No. 17 Manobi, Sargodha

نو تاریخیت: تعارف و تفہیم

Neo-Historicism: Introduction and Understanding

Abstract:

A critical approach developed in the 1980s through the works of Michel Foucault and Stephen Greenblatt, similar to Marxism. Moving away from text-centered schools of criticism such as New Criticism, New Historicism reopened the interpretation of literature to the social, political, and historical milieu that produced it. To a New Historicist, literature is not the record of a single mind, but the end product of a particular cultural moment. New Historicists look at literature alongside other cultural products of a particular historical period to illustrate how concepts, attitudes, and ideologies operated across a broader cultural spectrum that is not exclusively literary. In addition to analyzing the impact of historical context and ideology, New Historicists also acknowledge that their own criticism contains biases that derive from their historical position and ideology. Because

it is impossible to escape one's own "historicity," the meaning of a text is fluid, not fixed. New Historicists attempt to situate artistic texts both as products of a historical context and as the means to understand cultural and intellectual history.

Key Words: Neo-Historicism, Militants, Criticism, Marxism, Michel Foucault and Stephen Greenblatt, literature,

نو تاریخیت ایک ادبی تھیوری ہے جس کا مقصد دانشورانہ تاریخ کو ادب کے ذریعے جانچنا اور ادب کو ثقافتی تناظر میں پرکھنا ہے۔ آسان لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ادب اور ثقافت کی ہم رشتگی کا دوسرا نام نو تاریخیت ہے۔ اس میں اس بات پر بھی زور دیا جاتا ہے کہ ادب نہ صرف اپنے عہد کے حالات و واقعات سے اثر پذیر ہوتا ہے بلکہ ادب کو معرضِ تفہیم میں لانے والا قاری (نقاد) بھی عصری اور تاریخی صورت حال سے اثر قبول کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ نو تاریخیت کی ادبی تھیوری میں ادب کو تاریخ کے وسیع تر تناظر میں رکھ کر مصنف اور نقاد کے عہد کو جانچا جاتا ہے کہ "کیسے" اور "کس طرح" مصنف کے عہد سے ادب متاثر ہوا یا مصنف کے دور کی عصری صورتِ حال "کیسے" اور "کس طرح" ادب میں منعکس ہوئی۔ یہ سب ثقافتی تاریخ کو سمجھے بغیر ممکن نہیں۔ ادب کے سلسلے میں ایسے تصورات نو تاریخیت سے قبل ہیڈن وائٹ، گولڈمان، ریمنڈ ولیمز, فریڈرک جیمی سن اور کلی فورڈ کے ہاں بھی موجود تھے۔

نو تاریخیت کی ابتدا اس وقت ہوئی جب ہارورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر سٹیفن گرین بالٹ (Stephen Greenbalt) نے اسے اپنے مضامین میں استعمال کیا۔ اس کے بیشتر مضامین رسالہ "Genre" میں انیس صد اسی کی دہائی میں منظرِ عام پر آئے۔ "Genre" کے علاوہ وہ اپنے عہد کے معروف رسالے "Representation" کے مدیران میں بھی شامل رہا۔ اس رسالے میں نو تاریخیت سے متعلق متعدد مضامین شائع ہوئے، جن کو شائع کرنے کے عقب میں گرین بالٹ کا ہاتھ ہے۔ سٹیفن گرین بالٹ کے خیالات پر فرانسیسی مفکرین مشل فوکو اور آلتھیوسے کے اثرات نمایاں ہیں۔ فوکو نے اپنی تحریروں میں اس بات کا شدت سے احساس دلایا ہے کہ پرانی تاریخ نگاری کا متن طاقت سے منسلک ہے جو خاص ادارے کے مفادات کے تحفظ کے لیے تشکیل دیا جاتا ہے۔ پرانی تاریخ نگاری کو ثقافت کی متنوع جہات سے کوئی سروکار نہیں بلکہ متعینہ ثقافتی کلچر کی نشان دہی پر اس کا اختتام ہوتا ہے۔ مزید براں جوناتھن گولڈبرگ (Jonathan Goldberg)، لوئی مانٹروس (Lous Montrose)، لیونارڈ ٹینن ہاؤس (Leonard Tennen House)، ریمنڈ ولیمز (Raymond Williams) اور کیتھرین بیلسی (Catherine Belsey) نے بھی نو تاریخیت کو پروان چڑھانے میں اپنا کردار ادا کیا۔ یہ ذہن میں رہے کہ مذکورہ مفکرین ادبی نقاد ہیں، مؤرخین نہیں ہیں لیکن اس کے باوجود اپنی تحریروں کو نو تاریخیت سے ہم آہنگ کرنے کے خواہاں ہیں۔ ان کا یہ برملا دعویٰ نہیں ہے کہ وہ نو تاریخیت کے حامی ہیں لیکن ان کی تحریریں اس بات پر دال ہیں کہ انھیں نو تاریخیت کی ذیل میں پیش کیا جائے۔

گرین بالٹ کو نو تاریخیت کا پیش رو تسلیم کیا جاتا ہے۔اس نے Yale یونیورسٹی سے پی ایچ۔ڈی کی ڈگری ۱۹۶۹ء میں حاصل کی اور یونیورسٹی آف کیلی فورنیا میں بیس سال تک تدریس کے فرائض سر انجام دیتا رہا۔بعد ازاں وہ ہارورڈ یونیورسٹی سے منسلک ہو گیا۔پہلے پہل اس کے مضامین تنقیدی نوعیت کے حامل تھے لیکن بعد ازاں اس کے فکری رجحانات کا رخ ثقافتی شعریات کی جانب مڑ گیا۔اس کا سب سے اہم کام "Will in the World" ہے جو ولیم شیکسپیئر کی سوانح عمری ہے۔اس میں اس نے نو تاریخیت کے حربے کو استعمال کیا ہے۔مزید براں اس نے "Shakespear and the Exorcise" کے عنوان سے مضمون تحریر کیا جس میں اس تھیوری کا استعمال کیا۔اس نے اس اصطلاح کا استعمال "The Forms of Power and Power of Forms in the English Renaissance"(1982) میں کیا اور اس کے بعد دیگر ناقدین کے ہاں یہ اصطلاح رواج پا گئی۔

ثقافتی شعریات کے مضمرات سے استفادہ کرنے کے لیے اس نے مشل فوکو کی تحریروں کا بطور خاص مطالعہ کیا۔جس سے وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ بعض نقاد افسانہ نگار اور ناول نگار ایسے متن تخلیق کرتے ہیں کہ جو تاریخ کے حوالوں کے حامل ہوتے ہیں۔یہ تاریخی حوالے متن سے خارج میں موجود تاریخ کی نسبت سچائی پر مبنی ہوتے ہیں۔نو تاریخیت اسی مضمر تاریخ کی کھوج کا دوسرا نام ہے۔اسی لیے نو تاریخیت اس بات پر زور دیتی ہے کہ فن پارے کی تخلیق کے وقت سماجی رشتوں کی صورتِ حال کیا تھی۔مشل فوکو نے طبی اور قانونی اداروں کو طاقت سے جوڑا اور متن میں موجود آئیڈیالوجی کے طاقت سے رشتے کو معرض تفہیم میں لانے کی کوشش کی ہے۔نو تاریخیت کی اس جہت پر بات کرتے ہوئے وہاب اشرفی اپنی کتاب ''مابعد جدیدیت، مضمرات و ممکنات'' میں لکھتے ہیں:

> ''نئی تاریخیت کے مطابق ادب اور تاریخ میں اٹوٹ رشتہ ہے اس لیے تاریخ محض علم کا کوئی خزانہ نہیں ہے بلکہ ادبی متن کے طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔گویا ادب تاریخ کی نمائندگی کا ایک ذریعہ ہے جس میں بصیرتیں تاریخ کے عوامل کے ساتھ پیش ہوتی ہیں۔گویا ادب ہی تاریخ میں تبدیلی کا باعث ہے۔ Literature کے متون تاریخ کے واقعات پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔سیاسی سماجی معاملات میں نیز عقائد کے سلسلے میں بھی۔گویا تاریخی مطالعہ ادبی مطالعہ بھی ہے اور جس طرح کسی ادب کے متن کا جائزہ لیا جا سکتا ہے بالکل اسی طرح تاریخ کے متن کا بھی۔''(۱)

غور کیا جائے تو جملہ متون سماجی اور ثقافتی کوائف ہیں۔ تاریخ کی متنیت، متن کے لمحۂ تخلیق کے وقت موجود تاریخی حوالہ ہے۔ نو تاریخیت میں نقاد کی تمام تر توجہ سماج کی منطق پر مرکوز ہوتی ہے اور سماج و ثقافت سے ہٹ کر اس متن کے سلسلے میں کوئی بات نہیں کی جا سکتی۔ نو تاریخیت پر مزید بحث کرنے سے پہلے تاریخیت کے تصور کو سمجھنا لازمی ہے جس پر نو تاریخیت کی بنیادیں استوار ہیں۔

تاریخیت در اصل تاریخ کو معرض تفہیم میں لانے اور اسے استعمال کرنے کا طریقہ ہے۔ تاریخ کا علم رشتوں اور رابطوں کا علم ہے اور ان رشتوں اور رابطوں کو تاریخ کے مطالعے میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ تمام سماجی اور ثقافتی رشتوں اور مظاہر کا تعین تاریخیت کے ذریعے ہوتا ہے۔ چوں کہ ادب ثقافتی مظاہر میں سے ایک مظہر ہے اس لیے اس کے تعین اور قدر کے لیے تاریخیت کی تفہیم بھی لازمی قرار پاتی ہے۔ انگریزی ادب میں اس کا آغاز ۱۹۳۰ء اور ۱۹۴۰ء کی دہائیوں میں ہوا۔ امریکہ میں ماؤرس مینڈل بام (Maurrice Mandalbaum)، مارفن وائٹ (Morfon White) اور مورس آر کوہن (Morris R Chon) نے اس کو رواج دینے میں بنیادی کردار ادا کیا۔ امریکہ میں نو تاریخیت ادبی ہئیت پسندی کے ردِ عمل کے طور پر پروان چڑھی۔ جب کہ برطانیہ میں ایف۔ اے ہیل (F.A Hayal) اور کارل پاپر (Karl Popper) نے اس طرف توجہ دلائی۔ برطانیہ میں پروان چڑھنے والی تاریخیت میں کلیت کو بنیادی حیثیت حاصل ہے جس کے تحت کو مٹے اور مارکس کے خیالات کو زیادہ اہمیت ملی۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ اس پر تاریخ کے جدلیاتی تصور نے اپنے اثرات مرتسم کیے۔ تاریخیت کے حوالے سے بحث کرتے ہوئے ناصر عباس نیر اپنی کتاب "جدید اور مابعد جدید تنقید" میں رقمطراز ہیں:

> "اس طرح بیسویں صدی میں مختلف نظریات کے تعامل سے جو تاریخیت سامنے آئی، اس کے دو امتیازی اوصاف تھے۔ اول یہ کہ تاریخیت ایک منہاجیاتی اُصول (Methodological Principle) ہے جو کسی مظہر یا واقعے کو اس کے زمانی تناظر میں سمجھتا اور اس کی تعبیر کرتا ہے۔ دوم تاریخیت ہر واقعے کو (سماجی و ثقافتی) کُل کی نسبت سے سمجھتی ہے اور اسے کل (تشکیل) کا ایک مرحلہ گردانتی ہے، جس میں اس واقعے نے کوئی مخصوص کردار ادا کیا اور اپنی مخصوص قدر و معنویت قائم کی۔ یوں تاریخیت در اصل تاریخ کی فلسفیانہ بصیرت دریافت کرنے سے عبارت ہے۔"(۲)

تاریخیت ایک طرح کا اندازِ نظر ہے جو شے کی قدر و قیمت کا اندازہ اس کے زمانی و مکانی تناظر میں کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وقت بدلنے کے ساتھ ساتھ زمانی و مکانی تناظرات میں تبدیلی صورت پذیر ہوتی رہتی ہے۔ اس لیے شے کی قدر و قیمت کا جو تصور تاریخیت قائم کرے گی وہ مستقل اور ابدی نہیں ہو گا بلکہ لمحہ بہ لمحہ تغیر پذیر ہو گا۔ یوں تاریخیت کی رو سے اشیاء کی ماہیت اور قدر و قیمت مطلق نہیں بلکہ تناظر کی مرہون منت قرار پاتی ہے۔ سادہ اور مختصر لفظوں میں تاریخیت اضافیت کی قائل ہے۔

تاریخیت در اصل فرانسیسی اثباتیت پسند سینٹ سائمن اور آگسٹ کومٹے کی کارتیسی عقلیت پسندی کے ردِ عمل کے طور پر سامنے آئی، جسے جرمن مفکرین نے نپولین کی جنگ کے بعد سیاسی اور فلسفیانہ مقاصد کے تحت پروان چڑھایا۔ ان کا خیال تھا کہ ریاست کو بہتر طور پر چلانے کے لیے کارل مارکس کے تصورات کو بروئے کار لایا جانا چاہیے۔ کیوں کہ مارکس کے طے کردہ سماجی قوانین کی حیثیت وہی ہے جو طبعیات میں آئن سٹائن، حیاتیات میں ڈارون، نفسیات میں فرائیڈ اور لسانیات میں سوسئیر کی ہے۔ یوں تاریخیت میں کارل مارکس کے تصورات کلیدی حیثیت اختیار کر گئے۔ مارکسیت پسند اس بات کے قائل ہیں کہ ہر واقعے کو اس کی علت اور پس منظر کے تناظر میں سمجھا جائے۔ تاریخیت کے تصور نے بھی مارکس کے اس اصول سے استفادہ کیا اور علت و معلول اور پس منظر و پیش منظر میں تعلق کو نمایاں کیا۔ اس ضمن میں مارکسزم میں بنیادی اصطلاحات ''اساس'' اور ''بالائی ساخت'' کا حوالہ ضروری ہے۔ مارکسی تصورات میں اساس سے مراد وسائلِ پیداوار، معاشی قوتیں، پیداواری ذرائع اور پیداواری تعلقات ہیں۔ پیداواری تعلقات ایسے خیالات و نظریات کو جنم دیتے ہیں اور ایسے قوانین کو پیدا کرنے کا باعث بنتے ہیں جن سے معاشرے میں موجود طبقوں کی ایک ایسی ترتیب لگ جاتی ہے جس کو سماجی ساخت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ سماجی ساخت تغیر پذیر ہے کیوں کہ سماج میں ایک وقت میں ماضی کے پیداواری تعلقات کی باقیات بھی ہوتی ہیں اور مستقبل کی پیداواری قوتوں کو جنم دینے والے پیداواری تعلقات بھی ہوتے ہیں۔ ہر نئی نسل کو پرانی نسل سے جو ذرائع ورثہ میں ملتے ہیں وہ آنے والے دور میں ترقی کی بنیاد بن جاتے ہیں، یہی تاریخ کا تسلسل ہے۔ مارکسیت میں بالائی ساخت ان رابطوں، خیالوں اور اداروں کا مجموعہ ہے جو پیداواری تعلقات کی بنیاد پر جنم لیتے ہیں۔ روایتی مارکسی سوچ کے مطابق اساس اور بالائی ساخت میں براہ راست تعلق موجود ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ ادب اور ثقافت بنیادی معاشی نظام کے ماتحت ہوتے ہیں اور پیداواری قوتیں ہی ادب اور ثقافتی مظاہر کو اساس فراہم کرتی ہیں۔ مارکسیت میں علم، سیاست اور ثقافت کو انفرادی مظہر کے طور پر نہیں لیا جاتا جو تاریخ کے لیے ناگزیر ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر اپنی کتاب ''تنقیدی دبستان'' میں لکھتے ہیں:

> ”مارکسی تنقید میں ادب کے مطالعہ کے لیے سماجی حالات، طبقاتی تقسیم اور تاریخ کے مادی عوامل کا جائزہ لینا از حد ضروری ہے کیوں کہ ان سب کے درست تجزیہ کے بغیر کسی ادب پارے پر صحیح تنقید ہو ہی نہیں سکتی۔“(۳)

لیکن ان کلاسیکی مارکسی خیالات سے فرانسیسی مفکرین پئیر ماشرے، آلتھیوسے اور برطانوی نقاد ریمنڈ ولیمز نے اختلاف ظاہر کیا ہے۔ ان ناقدین نے اساس اور بالائی ساخت کے مابین تعلق کو بالواسطہ قرار دیا ہے اور ادب کی محدود خود مختاری کے تصور کو اپنایا ہے۔ یوں کارل مارکس کا فلسفہ تاریخیت کے لیے بنیادی اہمیت کا حامل قرار پایا۔

تاریخ کو ادبی مطالعے میں عموماً تین مقاصد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اوّل متن کس دور میں منصہ شہود پر آیا اور کن حالات وواقعات نے متن کی تخلیق کو متاثر کیا۔ دوم مصنف کے تخلیقی ذہن پر عصری صورتِ حال نے کیا اثرات مرتب کیے۔ مصنف متنوع تجربات سے گزرتے ہوئے جن حقائق تک پہنچا اس نے ان کو کس انداز سے تخلیق کا حصہ بنایا۔ اسی لیے مصنف کی سوانح اور شخصی نظریات کو اہمیت دی جاتی رہی ہے۔ سوم ان تاریخی قوتوں کا کھوج لگایا جائے جو تخلیق کے خاص عہد کا مزاج متعین کر رہی تھیں۔ مختصر الفاظ میں کہا جا سکتا ہے کہ تاریخ کو متن، مصنف اور تخلیق کی عصری صورتِ حال کی تفہیم و تعبیر کے لیے بروئے کار لایا گیا ہے۔ بیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں جب ساختیات حاوی فکر کے طور پر سامنے آئی تو اس وقت تاریخیت کے روایتی تصور میں تغیرات نمایاں ہوئے اور جملہ ثقافتی مظاہر کو متن کے طور پر پڑھا جانے لگا۔ ثقافتی مظاہر کو نشانات کے نظام کے طور پر زیرِ مطالعہ لایا گیا تو ان کے مظاہر کے افتراقات اُبھر کر منظرِ عام پر آئے۔ اب مرکز اپنی جگہ سے کھسک گیا اور اس کی جگہ پیٹرن نے لے لی۔ تاریخیت چوں کہ مرکز آشنا تصور تھا لہٰذا اس میں بھی تغیرات نمودار ہوئے اور تاریخیت کی جگہ نو تاریخیت اُبھر کر سامنے آئی۔

نو تاریخیت مابعد جدید فکر کی نمائندہ تھیوری ہے جس میں ساختیات کے بعض عناصر اور پس ساختیات کے بیشتر عناصر اپنی جھلک دکھاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کسی خاص نظریے اور مرکزی تھیوری کو ماننے سے قاصر ہے۔ نو تاریخیت خاص عہد کے ادبی متون کو اس عہد کے غیر ادبی متون کے متوازی قرأت پر زور دیتی ہے۔ دونوں طرح کے متون کو تاریخی معلومات کے حصول میں بنیادی اہمیت دی جاتی ہے، ادبی متن کو غیر ادبی فریم ورک میں غائر مطالعے سے جانچا جاتا ہے۔ متن کے بارے میں پس منظری خیالات کو نظر انداز کرتے ہوئے نئے سرے سے اس کا تاریخی مطالعہ کیا جاتا ہے تاکہ اس میں موجود نظریات اور ثقافتی مظاہر کی

نشان دہی کی جاسکے۔اس حوالے سے رانی پال اُکن (Ranni Paul Ukkan) نے اپنے مقالے میں Colebrook کا حوالہ دیا ہے:

> Rather than seeking the meaning of a text in the intention or mental content of either the author or the work, we could focus on the effect of the text in a network of practices. We could see the text as an effective symbol: a social fact which makes action meaningful and is a part of a culture's way of performing its actions in an ordered and understandable way. Description of texts would be 'thick' if they referred to the social and cultural forms in which the text operate."(۴)

نئی تاریخیت میں تاریخ کا مفہوم سیدھا اور سادہ نہیں ہے بلکہ یہ پیچیدہ اور متنوع جہات کا حامل ہے۔ تاریخ جتنی سامنے ہے اتنی پردے کے پیچھے بھی موجود ہے۔ تاریخ جس قدر نمایاں ہے اس قدر غیاب اور اوجھل بھی ہے۔اسی لیے اس میں عدم ربط اور عدم تسلسل کے سلسلے موجود ہیں۔ادب بھی اپنے اندر علامتی اور استعاراتی نظام لیے ہوتا ہے اور جتنا ظاہر ہوتا ہے اتنا ہی پس پردہ بھی ہوتا ہے جسے قاری نے دریافت کرنا ہوتا ہے۔اسی طرح تاریخ کے عقب میں بھی علامات موجود ہوتی ہیں اور اس علامتی عمل کی انگلی تاریخ کے ہاتھ میں موجود ہوتی ہے۔ تاریخ کے اس علامتی عمل کا تصور نو تاریخیت کے علم بردار گرین بلاٹ نے مشل فوکو سے مستعار لیا ہے جس نے تاریخ کو متن قرار دیا ہے۔ مشل فوکو کا خیال ہے کہ تاریخ واقعہ نہیں بلکہ ڈسکورس ہے جو طاقت اور غلبے کی خواہش سے صورت پذیر ہوتا ہے۔فوکو نے طاقت کو محض اقتصادی ملکیت سے منسلک نہیں کیا بلکہ اسے حکمتِ عملی سے موسوم کیا ہے۔یہ حکمت عملی کسی فرد، گروہ یا ادارے اور منصوبے کا نام نہیں بلکہ حکمت عملی کے انداز کے اثر کا نام ہے۔وہ طاقت اور غلبے کی خواہش کی متنوع جہات کو سماجی اداروں اور سماجی روابط میں سرایت کیے ہوئے دیکھتا ہے۔نو تاریخیت کی مذکورہ جہت کے حوالے سے ڈاکٹر اقبال آفاقی کی رائے ملاحظہ ہو:

> ”اس دعویٰ کے پیشِ نظر نشاۃِ ثانیہ کے لٹریچر کے مطالعہ سے یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ بہت سی ادبی تحریریں طاقت کے سوال سے مخاطب ہیں۔ طاقت کے مسئلے کے ارد گرد گھومتی ہیں جب کہ کچھ تحریریں اپنے عہد کے غالب نظریات کو متنازع بناتی ہیں۔کچھ لوگوں کے نزدیک ان کے مزاحمت کی راہ میں مملکت کی طاقت حائل ہے۔اگرچہ نو تاریخیت نے کچھ معاملات پر مابعد جدیدیت سے اختلافِ رائے کا اظہار کیا ہے لیکن بہت سے معاملات میں اس سے اخذ و اکتساب بھی کیا ہے۔“(۵)

فوکو کے ہاں ڈسکورس عدم قطعیت اور عدم تسلسل کا حامل ہے۔ بالفاظ دیگر تاریخ کے متن کا تانا بانا جگہ جگہ سے ادھڑا ہوا ہے اور اس میں خلا ہیں۔ درحقیقت تاریخ کے تسلسل میں یہ وہ خاموشی ہے جو تاریخ میں قوتِ گویائی کی حامل ہے لیکن بعض وجوہات پر اُسے دبا دیا گیا ہے۔ تاریخ کا مذکورہ تصور متنی تصور ہے اور مابعد جدید فکر کی رو سے کوئی متن قائم بالذات نہیں بلکہ ہر متن ''غیر'' کا مرہونِ منت ہے۔ یوں تاریخ کسی ایک شخص یا ایک مرکز کے گرد نہیں گھومتی بلکہ لامرکزیت کی حامل قرار پاتی ہے۔ فوکو اس بات کا بھی قائل ہے کہ تاریخ محض واقعات کا سیدھا سادہ ریکارڈ نہیں ہوتا بلکہ یہ کسی نہ کسی ڈسکورس سے متاثر ہوتی ہے اور خود بھی ڈسکورس کی حامل ہوتی ہے۔ فوکو کے خیالات مابعد جدید فکر کی پیداوار ہیں اس لیے وہ کسی مہابیانیہ کا قائل نہیں ہے۔ اب بڑی فلسفیانہ روایتوں کا دور گزر گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فوکو کلیت پسند فلسفے کا مخالف ہے کیوں کہ یہ استعماریت کا حامی ہوتا ہے۔ تمام مہابیانیے مثلاً مطلق صداقت، غیر طبقاتی معاشرہ، ترقی و خوشحالی اور امن و مسرت کا خواب وغیرہ اب ماضی کا قصہ بن چکے ہیں۔ مابعد جدید فکر میں وحدانی سماج ممکن نہیں کیوں کہ ایسا سماج جبر اور تشدد سے ہی ممکن ہوتا ہے۔ مابعد جدید معاشرہ رنگارنگ اور تکثیری سماج ہے۔

نو تاریخیت میں آزاد خیالی کو بنیادی دخل ہے جو ہر طرح کے تضادات اور انحرافات کو قبول کرنے کے لیے تیار ہے۔ تاہم یہ مارکسی آزادی سے مختلف ہے جو مزدور طبقے پر اپنی بنیادیں استوار کرتی ہے۔ مارک پوسٹر (Mark Poster) نے اس نقطے کی جانب توجہ مبذول کروائی کہ نو تاریخیت اور مشل فوکو کے تاریخ کے نظریے میں ایک تعلق موجود ہے۔ مشل فوکو نے اپنی توجہ مزدور طبقے سے ہٹا کر دیگر طبقوں کی طرف دلائی جو استحصال یا بیگانگی کا شکار تھے۔ مثلاً قیدی، خواتین، ہم جنس پرست اور اسی قبیل کے دیگر طبقے جو جدید معاشرے کی بے اعتنائی کا شکار تھے۔ نو تاریخیت میں ناقدین متن میں موجود حاشیائی اور دبائی گئی آوازوں کا کھوج لگا کر انھیں سامنے لاتے ہیں اور اس کی سیاسی قرأت پر زور دیتے ہیں۔ اس طرح ادب کی محدود خود مختاریت بھی ادب کے باطن میں مضمر نہیں بلکہ متن سے باہر موجود آئیڈیالوجی میں پوشیدہ ہے۔ گرین بلاٹ کا خیال ہے کہ شیکسپیئر کا ڈراما ''کنگ لئیر'' جس نظریاتی فضا میں تخلیق کیا گیا تھا وہ اب بھی موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کنگ لئیر آج کے زمانے میں بھی اتنی ہی دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے جتنا کہ شیکسپیئر کے دور میں پڑھا جاتا تھا۔ یوں نو تاریخیت ادب میں قارئین کی دلچسپی ادبی خصوصیات کے بجائے وہ نظریہ یا ثقافتی قالب قرار پاتا ہے جو ادب کے پس منظر میں موجود ہوتا ہے۔ ان وظائف کی بنیاد پر نو تاریخیت ''ثقافتی مادیت (Cultural Materialism)'' کے قریب چلی جاتی ہے، جس کے بڑے نمایندے ریمنڈ ولیمز اور کیتھرین بیلسی ہیں۔ اس موقع پر ادبی متن اور ثقافتی متن میں رشتہ قائم ہو جاتا ہے جو ادب اور ثقافت کی مخفی پرتوں کو سامنے لانے کا سبب بنتا ہے۔ گرین بلاٹ کا یہ نکتہ بھی قابلِ

غور ہے کہ جس ثقافتی اور نظریاتی قالب میں ادب پارہ تخلیق پذیر ہوتا ہے اس کا دوام ادب پارے کو بھی دوام بخش دیتا ہے۔ ثقافتی اور نظریاتی تناظر اگر وقتی اور لمحاتی ہو گا تو ادب پارے میں قارئین کی دلچسپی بھی وقتی اور لمحاتی ہو گی۔

نو تاریخیت نو آبادیاتی نقطۂ نظر سے بھی چیزوں کو دیکھنے کی دعوت دیتی ہے۔ جیسے آلتھیوسے، گرامچی، ایڈورڈ سعید اور گائتری نے ادبی متون کو دیکھنے کی کوشش کی ہے، ان مفکرین کی تحریروں سے عیاں ہوتا ہے کہ حکمران قوم جب محکوم کے سماج میں علمی، ثقافتی اور ادبی ترقی کی بات کرتی ہے تو اس کے پیچھے اس کی اپنی غرض و غایت چھپی ہوتی ہے۔ وہ اپنی قوت اور حکمرانی کو مستحکم رکھنے کی خاطر محکوم قوم کے ذہن اور دماغ بھی جیتنا چاہتے ہیں اور یہ اسی صورت ممکن ہو سکتا ہے جب ثقافتی، علمی اور ادبی ترقی کے نام پر ذہنوں کو متاثر کیا جائے۔ اس طرح طاقت سے نو آبادیاتی علوم کو علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ گائتری نے بھی نو آبادیاتی دور کے متون کے تجزیاتی مطالعے پیش کیے ہیں جن میں Subaltern طبقے کی آواز کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ عورتوں کا استحصال نو آبادیاتی مرحلے پر کئی سطحوں پر ہوتا رہا ہے۔ اس دور میں خواتین کی حیثیت سایہ سے زیادہ نہیں تھی۔ اسی طرح کی صورتِ حال کا اظہار بھابھا کی تحریروں میں بھی ہوا ہے جو ادبی تھیوریز کی سیاسی توجیہات بیان کرتا ہے اور اسے ادب سے علیحدہ کرنے کا حامی نہیں ہے۔

نو تاریخیت اور ثقافتی مادیت کی تھیوری ایک دوسرے کے خاصی قریب ہیں۔ جس طرح نو تاریخیت میں ادب اور ثقافت کے رشتے پر زور دیا جاتا ہے اسی طرح ثقافتی مادیت میں بھی ادب اور سماج کی نوعیت اور تعلق کو زیرِ بحث لایا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ریمنڈ ولیمز اور کیتھرین بیلسی کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے انسانی ثقافت کو یک زمانی نکتۂ نظر سے دیکھا ہے اور ثقافتی ساخت کو حاوی، باقیاتی اور نو خیز عناصر سے موسوم کیا ہے۔ کلاسیکی مارکسیت نے جو ثقافتی تھیوری پیش کی تھی وہ ''اساس'' اور ''بالائی ساخت'' کے تصورات پر مبنی تھی۔ جس کے مطابق معاشرے میں ہونے والی تمام علمی، سماجی، ثقافتی اور سیاسی سرگرمیاں اساس کی مرہونِ منت ہوتی ہیں۔ اس طرح اساس اور بالائی ساخت میں براہِ راست رشتہ قائم ہو جاتا ہے جس سے نو مارکسی تنقید انحراف کرتی دکھائی دیتی ہے۔ آلتھیوسے، پیئر ماشرے، جیمی سن اور ٹیری ایگلٹن اس تصور کا استرداد کرتے ہوئے ادب کی نیم خود مختاریت کے قائل ہیں۔ ریمنڈ ولیمز نے بھی مذکورہ مفکرین کے خیالات کو بنیاد بنایا ہے۔

ریمنڈ ولیمز نے ثقافت کا یک زمانی مطالعہ کرتے ہوئے اسے سہ جہاتی قرار دیا ہے۔ جن جہات کو وہ زیرِ بحث لایا ہے وہ حاوی، باقیاتی اور نو خیز ہیں۔ ثقافت کی حاوی جہت وہ ہے جسے مقتدر طبقہ متعین کرتا ہے۔ باقیاتی جہت میں وہ اقدار شامل ہوتی ہیں جن کی ماضی میں تشکیل ہوئی اور وہ اب بھی فعال اور متحرک ہیں۔ حاوی ثقافت تشکیل شدہ ہوتی ہے جو طاقت اور غلبے کی خواہش سے

جڑی ہوتی ہے، اس کے برعکس باقیاتی ثقافت خودرو پودے کی مانند ہے جس کی جڑیں سماج کے ماضی میں موجود ہوتی ہیں اور یہ اپنی تما م تر توانائی سماج کے داخل سے کشید کرتی ہے۔ یہ ثقافت حاوی ثقافت سے ذرا فاصلے پر عمل آرا ہوتی ہے۔ اس کا مطلب قطعاً یہ نہیں ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے بے نیاز اور بے گانہ ہیں۔ بلکہ یوں کہا جائے کہ یہ ایک دوسرے کے متخالف (Oppositional) ہیں تو غلط نہ ہو گا۔ باقیاتی ثقافت حاوی ثقافت کو قبول کرنے سے ہچکچاہٹ کا شکار ہوتی ہے، جب کہ حاوی ثقافت دیگر جہات کو بے دخل کر کے اپنے آپ کو منوانے کی متمنی رہتی ہے۔ ثقافت کی تیسری جہت نوخیز ہے جس میں وہ اقدار اور اعمال شامل ہیں جو ارتقاء کے نتیجے میں سامنے آتے ہیں۔ اس کا تعلق تخلیقیت سے ہے۔ نئے معنی، نئی اقدار اور ثقافتی رشتے وقت گزرنے کے ساتھ نمودار ہوتے رہتے ہیں جس سے نیا کلچر تشکیل پذیر ہوتا رہتا ہے۔ ثقافتی مادیت پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے ناصر عباس نیر لکھتے ہیں:

بے شبہ یہ ایک بصیرت افروز تھیوری ہے اور کلچر کی مختلف سطحوں کی تقسیم میں بڑی حد تک معاون ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا انسانی کلچر صرف اسی ساختیے میں اپنا اظہار کرتا ہے؟ ولیمز کی اس تھیوری کو ایسے آفاقی اور سائنسی اصولوں کا درجہ دیا جا سکتا ہے جو نہ صرف انسانی کلچر کی جملہ جہات کا احاطہ کرتی ہوں بلکہ کلچر کی پرداخت و نمو کے سارے مراحل کی وضاحت بھی کرتے ہوں؟ اصل یہ ہے کہ کلچر کا تعلق انسان کی نفسی اور تخلیقی توانائی سے ہے۔ یہ ایک ایسا نشانیاتی نظام ہے جس میں انسان کی تمام سرگرمیاں اپنا تجربہ کرتی خود کو دریافت کرتی اور واقع ہوتی ہیں۔ چوں کہ انسان کی نفسی اور تخلیقی توانائی محدود نہیں ہے اس لیے کوئی بھی ثقافتی نظام انسان کی پوری تخلیقی توانائی کو شامل اور صرف کرنے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔"(۶)

ریمنڈ ولیمز کی ثقافتی تھیوری ادبی متن کو نئے انداز سے پیش کرنے کی داعی ہے۔ اسی طرح اگر کیتھرین بیلسی کی تھیوری پر نگاہ ڈالی جائے تو عیاں ہوتا ہے کہ اس نے ریمنڈ ولیمز کی نسبت تاریخ پر زیادہ توجہ مرکوز کی ہے۔ اس نے سیاست اور ادب کے باہمی تعلق پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے اس بات کی تائید کی ہے کہ ادب کسی بھی معاشرے کی سیاسی تاریخ سے الگ نہیں ہو سکتا۔ یوں وہ ادب کے خود مرتکز اور خود مختار ہونے سے انکار کرتی ہے۔ مذکورہ موقف کو جاندار بنانے کے لیے وہ مشل فوکو کے تصورِ تاریخ سے بھرپور استفادہ کرتی ہے۔

مشل فوکو تاریخ کو ایک متن کے طور پر دیکھتا ہے۔ وہ متن کے مدلول میں تغیر اور بے ثباتی کا قائل ہے لیکن ژاک دریدا کی طرح وہ معنی کے التوا کو لامحدود خیال نہیں کرتا اور نہ وہ معنی کے التوا کو لسانی افتراق کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔ مشل فوکو جب تاریخ کو بطور متن لیتا ہے تو اس کے مدلول کو طاقت سے جوڑتا ہے۔ دیکھا جائے تو معنی کے مسلسل ملتوی ہونے سے نہ تو تناظر قائم ہو پائے گا

نہ اس کا تجربہ ممکن ہو گا۔یوں دریدا کے ہاں تاریخ اور سیاست کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ مگر فوکو کے ہاں ہر معنی ثقافت اور سماج سے منسلک ہے۔ سماج کے تاریخی عمل میں متعدد قوتیں کار فرما ہوتی ہیں۔ ہر قوت دوسری کو شکست دینے کی خواہاں ہوتی ہے جس کے پسِ پشت مخصوص معنی کار فرما ہوتے ہیں۔ دراصل یہ معنی اپنی برتری قائم کرنا چاہ رہے ہوتے ہیں۔ فوکو کے تصورِ تاریخ کو واضح کرتے ہوئے ناصر عباس نیر لکھتے ہیں:

"فوکو کے تصورِ تاریخ میں ایک نازک نکتہ یہ ہے کہ تاریخ ایک متن ہے، نشان کی طرح اس کا مدلول بھی ہے اور Referent بھی ہے (وہ شے جس کے لیے کوئی نشان وضع ہو)۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ Referent واحد ہوتا ہے، مگر مدلول ایک سے زائد ہوتے ہیں۔ تاریخ کا Referent وہ واقعات ہیں جنھیں قلم بند کیا گیا ہے۔ مگر تاریخ کے معنی اور مدلولات اس referent یا واقعات سے کہیں آگے اور زائد ہیں۔ تاہم یہ سارے معنی ڈسکورس کے اندر ہیں۔"(۷)

کیتھرین بیلسی فوکو کے ان تصورات کو اپنی تھیوری میں خوب صورتی سے استعمال کرتی ہے۔اس کے خیال میں متن کی قرأت کسی نہ کسی تناظر میں ہوتی ہے۔ ہر تناظر کے پسِ پشت کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے اور یہ مضمر مقصد اپنے عہد کے ڈسکورس سے جڑا ہوتا ہے۔اس طرح قرأت جمالیاتی سے زیادہ ثقافتی عمل بن جاتا ہے۔

جس طرح تاریخ بے مرکزیت کا شکار ہوتی ہے اسی طرح ادبی متن بھی بے مرکزیت کا حامل ہوتا ہے۔ متن سے متعدد معانی بر آمد ہوتے ہیں، یہ معنی مصنف کی منشا اور اس کے سوانحی اور تاریخی حالات کے آئینہ دار نہیں ہوتے۔ادب کے ایسے تجزیے سے سیاسی تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے، کیتھرین بیلسی کے نظریات چوں کہ مشل فوکو کے نظریات سے مطابقت رکھتے ہیں اسی لیے وہ اس بات کی قائل ہے کہ تاریخ میں طاقت اور سیاست لازم ہیں۔یہی وجہ ہے کہ وہ متن سے بر آمد ہونے والے معنی کو سیاسی تاریخ کے مترادف خیال کرتی ہے۔وہ ادبی اور تاریخی متن میں فرق روا رکھنے کی بھی قائل نہیں۔ جس طرح تاریخ متعدد متنوع سوالات کی آماج گاہ ہے بالکل اسی طرح ادب بھی متعدد معانی کی آماج گاہ اور بے مرکز ہے۔بے مرکزیت اور کثیر المعنویت کیتھرین بیلسی کے نکتۂ نظر کو مابعد جدید صورتِ حال سے ہم آہنگ کر دیتی ہے۔

کیتھرین بیلسی اپنی کتاب Critical Practice" "میں لکھتی ہیں کہ ادب اُس دور کے بارے میں معلومات فراہم کرتا ہے، جس میں اسے تخلیق کیا گیا ہے۔ یہ آفاقی سچائیوں اور انسانی فطرت کا خوب صورت عکاس ہوتا ہے۔ مصنف اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اپنے مشاہدات اور خیالات کو ادب کا حصہ بناتا ہے۔ کیتھرین بیلسی اسے "Expressive Realism" سے موسوم کرتی ہے۔جب قاری کوئی تحریر پڑھتا ہے تو وہ اس بات کو محسوس کر لیتا ہے کہ متن اپنے ارد گرد کے حقائق کو منعکس کر رہا

ہے۔ مذکورہ نظریہ حقیقت کو ایسی چیز خیال کرتا ہے جو پہلے سے موجود ہے اور زبان اس کو الفاظ میں ڈھال لیتی ہے۔ حقیقت خود سے کوئی وجود نہیں رکھتی بلکہ زبان کے اندر تشکیل دیا گیا ایک ڈھانچہ ہے۔ جس کی بنیاد پر ہم اپنی خارجی دنیا کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ سب سے پہلے ساختیات نے اس جانب توجہ مبذول کی کہ زبان کس طرح حقیقت کی تشکیل میں اپنا کردار ادا کرتی ہے۔ دال اور مدلول میں من مانا تعلق ثابت کر کے اس نے اس بات کا ثبوت دیا کہ دنیا میں کوئی حقیقت موجود نہیں بلکہ زبان جس طرح سے دنیا کو مختلف سانچوں میں تقسیم کرتی ہے ہم اسی کو درست تصور کر لیتے ہیں۔ جس طرح زبان کی ایک لینگ ہوتی ہے بالکل اسی طرح معاشرے کی بھی ایک لینگ ہوتی ہے۔ اس کے قوانین و ضوابط سے باہر ہو کر کچھ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ "Expressive Realism" کا نظریہ اس بات سے انحراف کرتا ہے۔ اس حوالے سے شہریار خان نے اپنے مضمون ''کیتھرین بیلسی کے تنقیدی نظریات'' میں بیان کیا ہے:

''بیلسی کے مطابق بیسویں صدی میں تین مکاتبِ فکر نے اپنے اپنے انداز میں Expressive Rrealism کے ان نظریات کو رد کرنے کی کوشش کی لیکن وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ New Critism نے تحریر کو مصنف کی گرفت سے آزاد کرانے کے لیے تحریر کے اپنے اندر کے تضادات اور تناؤ کو معانی کا منبع قرار دیا لیکن اس چیز کو بالکل نظر انداز کر دیا کہ ایک تحریر یا نظم زبان کے اندر لکھی جاتی ہے اور زبان کا حقیقت کے ساتھ تعلق ہے اور جب تک اس تعلق پر بات نہیں کی جائے گی تو تنقیدی عمل منجمد رہے گا۔ دوسری طرف Northrope Fry نے ادب کو مختلف Archetype کے ذریعے سمجھنے کا نظریہ پیش کیا۔ اس کے خیال میں یہ Archetype دنیا کے تمام ادب میں مشترک ہے۔ لیکن اس نے بھی پہلے سے فرض کیا کہ انسانی فطرت ایک مطلق چیز کا نام ہے جو زمان و مکاں کی قید سے آزاد ہے۔ اس بات کا اس کے ہاں کوئی ذکر نہیں ملتا کہ حقیقت کیا ہے اور زبان کیسے حقیقت کی تشکیل کرتی ہے۔ Reader Response Criticism نے مصنف کی اجارہ داری ختم کرنے کے لیے قاری کو معنی کا منبع بنانے کی کوشش کی لیکن اس کوشش میں انھوں نے ایک مصنف کی جگہ ایک بہت ہی آگاہ اور بڑھے لکھے قاری کو دی۔ اس طرح سے ان میں سے کوئی بھی Expressive Realism کو مکمل طور پر رد نہ کر سکا۔''(۸)

یہ ساختیات کا نظریہ تھا جس نے "Expressive Realism -" کا استرداد کرنے کی کوشش کی اور بتایا کہ حقیقت دنیا میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو پہلے سے موجود ہو بلکہ زبان ہی ہے جو حقیقت کو تشکیل کرنے کا باعث بنتی ہے۔ کیتھرین بیلسی اپنے خیالات کو تقویت دینے کے لیے آلتھیوسے اور پئیر ماشرے کے تصورات کا سہارا لیتی ہے۔ اور اس بات کی قائل نظر آتی ہے کہ ادب کے لیے نئے تنقیدی عمل کو سامنے لایا جائے، جو تحریر کی کثیر المعنویت کو اجاگر کرے، جس کے تحت ''متن کی خاموشی'' آواز میں بدل جائے۔

پس نئی تاریخیت مابعد جدید فکر کا اہم مظہر ہے جو ادب اور تاریخ کے رشتے پر زور دیتا ہے۔ مذکورہ تھیوری کے پیشِ نظر ادب اپنے خارجی منظر نامے سے منسلک ہو جاتا ہے۔ خارجی منظر نامہ ادب اور تاریخ کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ کرتا ہے۔ خارج میں موجود آئیڈیالوجی متعدد ایسے عناصر کو چھپاتی ہے جہاں تضادات موجود ہوتے ہیں۔ نو تاریخیت دراصل ادب کے ذریعے ان تضادات کو سامنے لانے کی کوشش کا نام ہے جو تاریخی عمل کو سمجھے بغیر ممکن نہیں۔

حوالہ جات

۱۔ وہاب اشرفی، ''مابعد جدیدیت، مضمرات و ممکنات''، اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۰۷ء، ص:۱۲۳

۲۔ ناصر عباس نیر، ''جدید اور مابعد جدید تنقید (مغربی اور اردو تناظر میں)''، کراچی: انجمنِ ترقیٔ اردو پاکستان، ۲۰۰۴ء، ص:۲۵۱

۳۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، ''تنقیدی دبستان''، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء، ص:۱۷۷

۴۔ Ranni Paul Ukkan, "A new historical reading of Anne Tyler's fiction" Thesis. Department of English, University of Calicut, 2002, p:4

۵۔ اقبال آفاقی، ڈاکٹر، ''مابعد جدیدت (اصطلاحات اور معانی و تعبیرات و تشریحات)''، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۶ء، ص:۸۹

۶۔ ناصر عباس نیر، ''جدید اور مابعد جدید تنقید (مغربی اور اردو تناظر میں)''، محولہ بالا ۲، ص:۲۶۳

۷۔ ایضاً، ص:۲۶۵

۸۔ شہر یار خان، ''کیتھرین بیلسی کے تنقیدی نظریات''، مشمولہ: نقاط، (مدیر: قاسم یعقوب) فیصل آباد، شمارہ ۲۰۱۳-۱۵ء، ص:۶۶